

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## اشکات

انبیائے کرام عظیم السلام جن طرح لوگوں کو مخاطب کرنے میں ایک خاص ترتیب کا لحاظ رکھتے ہیں اور یہ ترتیب تبلیغ و دعوت کسی ایک بہت بڑی حکمت پر مبنی ہوتی ہے جو اس ترتیب کو الٹ دینے کی صورت میں جیسا کہ ہم اس سلسلہ کی کئی کھلی قطا میں بیان کر چکے ہیں، مفقود ہو جاتی ہے اسی طرح جن باتوں کو انبیائے کرام پیش کرتے ہیں ان کو پیش کرنے میں بھی ایک خاص تدریج کا اہتمام کرتے ہیں اور وہ تدریج بھی دعوت دین میں ایسی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کا اگر لحاظ نہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ نہ صرف ساری محنت اکارت ہو کے رہ جائے، بلکہ اس کا بھی اندیشہ ہے کہ اس سے الٹے و عکس طور پر دین کے مقصد کو نقصان پہنچ جائے۔ اس وجہ سے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جس طرح ہم نے تفصیل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی ہے کہ تبلیغ دین کے لیے لوگوں کو مخاطب کرنے میں کیا ترتیب اختیار کی جائے اسی طرح تفصیل کے ساتھ یہ بات بھی بیان کر دیں کہ دین کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں کیا تدریج ملحوظ رکھی جائے۔

بظاہر تو یہ ایک واضح سی بات معلوم ہوتی ہے جس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہے حقیقت میں یہ عام طور پر غمی اور اس کے ضمنی ہونے ہی کی وجہ سے بسا اوقات لوگ ہم پر ایسے اعتراضات کر جاتے ہیں جن کا کوئی موقع نہیں ہوتا، مثلاً بہت سے لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ ہم تو حیدر و رسالت کی اصولی مسائل پر قبضہ زور دیتے ہیں اتنا لوگوں کی وضع قطع اسلامی بنانے پر زور نہیں دیتے۔ اور ہماری اس کے پڑوانی کا نتیجہ ہے کہ جماعت اسلامی کے ارکان لباس، ڈاڑھی، وضع و ہیئت اور آداب زندگی میں اہل تقویٰ اور

متشرعین کے معیار پر نہیں ہیں بلکہ اس طرح کے امور میں ان میں عام طور پر فطرت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک دوسرا گروہ ہم پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ تم لوگ اقامت دین کا مقصد لے کر اٹھے ہو تو صرف توحید اور رسالت کے وعظ پر کیوں قانع ہو گئے ہو!۔ تمام معاشرہ و ریاست اور کاروبار میں اسلامی توحید ہی کی پابندی کیوں نہیں کرتے؟ ہر حرام و ناجائز سے اجتناب کئی کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟ اپنے اندر اسلامی حدود و تعزیرات کیوں نہیں جاری کرتے؟ طاغوت سے عملاً مگر لینے کے لیے سبقت کیوں نہیں کرتے؟ یہ اور اس قبیل کے بہت سے اعتراضات ہمارے مخالفین اور موافقین کی طرف سے اکثر آتے رہتے ہیں۔ مخالفین کی نکتہ چینیوں کو تو ہم زیادہ اہمیت نہیں دیتے کیونکہ یہ حضرات اس طرح کے اعتراضات محض اس لیے تراشتے رہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی غلط زندگی کو صحیح ثابت کر دیں اور ہماری نسبت لوگوں میں کچھ بدگمانیاں پیدا کر دیں۔ ان لوگوں کی ذہنیت بالکل وہی ہے جو حضرت یحییٰ کے ان معترضین کی تھی جو ان کی دعوت کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ ان کے شاگرد بغیر ہاتھ دھوئے بھی کبھی کھا گا کھا لیتے ہیں اور ان کے توحید کے وعظ پر یہ معارضہ کرتے تھے کہ قیصر کو خراج دینا چاہیے کہ نہیں؟ اس طرح کے نکتہ چینیوں کا ایک گروہ بد دعوتِ حق کے ساتھ جنم لیتا ہے اور اہل فتنہ کو فتنہ میں مبتلا رکھنے کے لیے اپنے ”زخرف العول“ کے جراثیم لوگوں میں پھیلاتا رہتا ہے۔ ان کے مقابل میں کسی داعیِ حق کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ صبر کرے لیکن اسی طرح کے اعتراضات بسا اوقات ان لوگوں کی طرف سے بھی آتے ہیں جو ہمارے مقصد کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں اور اس کام میں ان کا وہی تعاون ہمارے ساتھ ہے۔ یہ لوگ اس طرح کے اعتراضات بدنبیتی سے نہیں کرتے بلکہ فی الحقیقت وہ بعض اصولی باتوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اس طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن کا صاف ہونا ضروری ہے۔

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو ہمارا صحیح موقف نہیں معلوم ہے۔ یہ ہم کو ایک بنی بنائی صالح جماعت کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بار سنبھالنے والی ایک جماعت تصور کرتے ہیں جس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ جماعت کے اندر جس گوشہ میں بھی کوئی فساد دیکھے بڑھ کر اس کی اصلاح کرے

اور جو بات بھی خدا کے قانون کے خلاف پائے اس کو خدا کے قانون کے مطابق کر دے۔ حالانکہ ہماری حیثیت یہ نہیں ہے بلکہ ہماری حیثیت یہ ہے کہ ہم ایک ایسی سرزمین پر دین حق کی دعوت لے کر اٹھے ہیں جہاں نظام حق بالکل درہم برہم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ پر ایک مضبوط نظام باطل نے قائم ہو کر فضا میں اپنی شاخیں اور زمین میں دوڑتے اپنی جڑیں پھیلا دی ہیں۔ اس طرح کی جماعت کا طریق کار قدرتی طور پر سابق الذکر جماعت سے بالکل مختلف ہوگا اور جو لوگ دونوں کے فرق کو نہیں سمجھ رہے ہیں یا غلط فہمی سے دوسری کو پہلی جماعت سمجھ رہے ہیں ان کے ذہن میں التباس کی وجہ سے شبہات پیدا ہی ہوں گے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان حضرات کے ذہن میں اس امر کا کوئی واضح تصور موجود نہیں ہے کہ ایک جماعت جو اس مقصد کے ساتھ اٹھی ہو کہ لوگوں کو ایک نظام باطل کے اندر سے کھینچ کھینچ کر نظام حق کی طرف لائے اس کو اپنے مقصد کو پیش کرنے میں تدریج اختیار کرنی پڑتی ہے۔ ان کے نزدیک دین کا ہر کام یکساں اہمیت رکھتا ہے اور جس نقطہ سے بھی دین کی خدمت شروع کر دی جائے دین ہی کی خدمت ہے اور چونکہ اللہ کا پورا دین اترا ہوا قرآن و حدیث کی صورت میں لوگوں کے پاس موجود ہے اس وجہ سے یہ خواہش بھی پیدا ہوتی ہے کہ بیک دفعہ پورا دین خود بھی اٹھالیں اور دوسروں پر بھی لا دیں۔ نیز چونکہ ان لوگوں کا دینی تصور کچھ بلند نہیں ہے اس وجہ سے اجزا دین میں سے ان چیزوں پر ان لوگوں کی نظر سب سے پہلے پڑتی ہے جو اگرچہ فلسفہ دین کے اعتبار سے کچھ ایسی اہمیت نہ رکھتے ہوں لیکن چونکہ ایک مدت سے وہ دیندارانہ زندگی کے نمایاں خط و خال سمجھ لیے گئے ہیں اس وجہ سے اصل دین سے ان کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے ضروری ہے کہ اس تدریج کو سمجھا جائے جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی دعوت کو پیش کرنے میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ چونکہ انبیاء کی بعثت ایسے زمانہ میں ہوتی ہے جب نظام حق بالکل درہم برہم ہو چکا ہوتا ہے اور ایک جاہلی نظام سوسائٹی کو اپنے گھیرے میں لیتا ہے

اس وجہ سے وہ سبکے پہلے ان مبادی کی دعوت بلند کرتے ہیں جن کی بنیادوں پر خالص اسلامی سوسائٹی کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ مبادی تین ہیں :-

(۱) خدا پر ایمان، کامل توحید کے ساتھ۔

(۲) رسالت پر ایمان، کامل اطاعت کے ساتھ۔

(۳) آخرت پر ایمان، کامل تقویٰ کے ساتھ۔

یہی تین چیزیں ہیں جن کے اندر خرابی پیدا ہونے سے سوسائٹی جاہلیت کی طرف کھسکنی شروع ہوتی ہے اور جب ان میں پوری طرح فساد رونما ہو جاتا ہے تو پوری سوسائٹی پر جاہلیت کی ظلمت چھا جاتی ہے اور انہی تینوں چیزوں کے آشکارا ہونے سے سوسائٹی اسلام کی طرف بڑھنا شروع کرتی ہے اور جب یہ پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتی ہیں تو سوسائٹی پورے دن کی روشنی میں آجاتی ہے۔ ان تینوں چیزوں کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندر اتنا راسخ ہے کہ دنیا میں ان کا انکار بہت کم کیا گیا ہے لیکن چونکہ شیطان کو اچھی طرح پتہ ہے کہ انہی چیزوں پر نظام حق کی بنیادیں قائم ہیں اس وجہ سے اس کی ساری کوشش ہمیشہ اس بات کے لیے رہی ہے کہ کسی طرح ان میں کوئی رخنہ ضرور پیدا کرے چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جس طرح ان کا انکار بہت کم کیا گیا ہے اسی طرح شیطان کی کوششوں کا یہ اثر ہے کہ ان کا صحیح صحیح اقرار بھی بہت کم کیا گیا ہے۔ ان عقائد کے باب میں دنیا کی اصلی روش انکار کی رہی ہے ہمیشہ صاف صاف اقرار کی بلکہ بیشتر اقرار مع انکار کی رہی ہے اور یہی وہ گروہ ہے جو اس رشتہ میں بار بار پڑتی رہی ہے اور اسی کو کھولنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو بھیجا اور کتابیں نازل فرمائیں

اگر معاملہ ان کے انکار کا ہو تو چند ان شکل نہیں ہے۔ یہ انسانی فطرت کے لیے اپنے اندر اتنی کشش رکھتے ہیں کہ تھوڑی سی جدوجہد سے تمام سلیم الفطرت انسانوں کے اندر ان کا اعتقاد پیدا کیا جاسکتا ہے لیکن اس معاملہ میں دنیا نے انکار کی روش، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بہت کم اختیار کی ہے بلکہ بیشتر اقرار مع انکار کی روش اختیار کی ہے اور یہ اقرار مع انکار دعوت و اصلاح کے راستہ کا وہ پتھر ہے جس کو



ہٹانے کے تصور سے ان لوگوں کا زہرہ آب ہوتا ہے جو اس کے ثقل سے بھی واقف ہیں اور ان سانپوں  
 بچھووں اور اندھوں سے بھی واقف ہیں جو اس کے جنبش میں آتے ہی اس کے نیچے سے سیلاب کے  
 ماٹیل ابل پڑتے ہیں اور ان لوگوں سے چمٹ جاتے ہیں جو اس پتھر کو کھسکانا چاہتے ہیں لیکن انبیاء کرام  
 کو اور ان لوگوں کو جو دنیا کو راہ راست کی دعوت دیتے ہیں بالعموم ایسے ہی فاسد العقیدہ لوگوں کے  
 کشمکش کرنی پڑتی ہے جو باطل کو حق میں ملا کر اس کی پرستش کرتے ہیں اور خدا کے دین اور اپنے نفس کی  
 خواہشوں میں مصالحت کر کے ایک نیا نظام کھڑا کر لیتے ہیں اور اس کو پرانے نظام کا نام دے لیتے  
 ہیں۔ اس طرح کے لوگ اپنے باطل کی حفاظت کے لیے چونکہ حق کو سپر بنا لے ہوئے ہوتے ہیں اس  
 لیے ان پر پوری آزادی کے ساتھ بیک دفعہ ضرب نہیں لگائی جاسکتی بلکہ آہستہ آہستہ ان کے اعمال  
 و معتقدات میں سے حق کے اجزاء کو الگ اور باطل کے اجزاء کو الگ کرنا پڑتا ہے اور چونکہ ان کا ہر باطل  
 حق بن کر پھنچ چکا ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی جدائی ان کو اتنی شاق گذرتی ہے کہ وہ ان میں سے  
 ایک ایک پر مورچے قائم کرتے ہیں اور اس وقت تک اس کو نہیں چھوڑتے جب تک اس کی حمایت  
 بالکل مایوس نہ ہو جائیں۔ یہ کام بڑا دیر طلب ہے، اس میں بڑی دیدہ ریزی، بڑے صبر اور بڑے علم  
 کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی بے لاگ حق پرستی بھی اس راہ میں مطلوب ہے کیونکہ جن لوگوں کے متعلق  
 آدمی کا خیال یہ ہو کہ ان کے انکار کے ساتھ اقرار بھی شامل ہے، قدرتی طور پر ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں  
 وہ نرمی کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس نرمی کا سارا فائدہ باطل کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ حق کو۔

بہر حال مذکورہ بالا بنیادی اصولوں کو مان کر جو لوگ ایک جماعت بن جاتے ہیں ان لوگوں کو  
 بنیائے کرام ان باتوں کی تعلیم شروع کرتے ہیں جن سے ایک طرف تو وہ خدا سے بہتر سے بہتر طریق  
 پر چڑ جائیں، دوسری طرف آپس میں بالکل مربوط ہو جائیں۔ یہ خدا اور بندوں سے ٹھیک ٹھیک جوڑنا  
 والے اصول انہی تین اصولوں سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے اس وجہ سے ان لوگوں  
 کو ان کے قبول کرینے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی جو ان تینوں اصولوں کو مان چکے ہوں۔ ایک نئے

کو مان لینے کے بعد کوئی دیا نندار شخص اس کے لوازم کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا کیونکہ ایک نئے کے لوازم کی حیثیت تو حقیقت اجمال کے بعد تفصیل کی ہوتی ہے۔ لیکن اس تفصیل کو بھی انبیاء کرام مجبوراً دیکر جن لوگوں نے اصول تسلیم کر لیے ہیں وہ لازماً قروع کو بھی مان ہی لیں گے۔ یوں ہی کیفیات مافوق لوگوں کے سامنے پھینکنا نہیں شروع کر دیتے بلکہ ایک حکیمانہ ترتیب و تدریج کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اسی ترتیب و تدریج کے اندر ان کے مشن کی کامیابی کا اصل راز مضمر ہوتا ہے۔ اس ترتیب میں دو پہلو مد نظر ہوتے ہیں ایک جماعت کی ذہنی استعداد کا، دوسرا جماعت کی اجتماعی استطاعت کا۔ یہ دونوں چیزیں کسی قدر وضاحت کی محتاج ہیں۔

ذہنی استعداد سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ دین کے احکام و تعلیمات میں ایک نظم (سسٹم) ہے۔ اس کے کچھ بنیادی کلیات ہیں، ان سے کچھ مبادی پیدا ہوتے ہیں، پھر ان سے اصولی تعلیمات پیدا ہوتی ہیں، پھر ان سے جزئیات و فروع وجود میں آتی ہیں۔ جو شخص اسی ترتیب و تدریج کے ساتھ دین کو سیکھتا ہے وہ ایک طرف تو ہر مرحلہ میں دوسرے مرحلہ کے لیے اپنے اندر استعداد پیدا کر لیتا ہے اور دوسری طرف اس پورے سسٹم سے واقف ہو جاتا ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔ اس کی مثال بالکل یہ ہے کہ ایک بچہ کو پہلے حروف تہجی کی تعلیم دی جائے، پھر ان کو آپس میں جوڑنا اور ملانا سکھایا جائے، پھر اس کو الفاظ اور جملوں کے پڑھنے کی مشق کرائی جائے۔ پھر اس کے سامنے پڑھنے کے لیے ایک پوری عبارت رکھ دی جائے چونکہ وہ حروف سے عبارت تک درجہ بدرجہ اس سسٹم کو سمجھتا ہوا آیا ہے جو اس کے اندر ملحوظ ہے اس وجہ سے ہر منزل میں اس نے آگے کی منزل کی استعداد ہم پہنچانی ہے اور کوئی چیز اس کی طبیعت پر بار نہیں پڑتی جو بلکہ ہر استعداد چونکہ فطرۃً فعلی چاہتی ہے اس وجہ سے اس نے ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں منتقل ہونے کے لیے اپنی طبیعت کے اندر خود ایک تقاضا محسوس کیا ہے۔ اس کے برعکس جس شخص نے دین کو اس طرح نہیں پایا ہے بلکہ اس کے مختلف حصے اس کے سامنے بے ربط بیٹے ترتیب رکھ دیے ہیں اس کی مثال بالکل اس بچہ کی ہے جس کو تمام ابتدائی مراحل سے گزارے بغیر کوئی عبارت رٹا دی گئی ہو

جس کو وہ رٹ توئے گا اور حافظہ کی مدد سے دہرا بھی سکے گا لیکن وہ ہمیشہ اس کے حافظہ پر ایک بار ہوگی۔ کبھی اس کی فطری استعداد کا جزو نہیں بن سکے گی۔ انبیاء کرام علیہم السلام دین کو پیش کرنے میں یہ طریقہ کبھی نہیں اختیار کرتے بلکہ فطری اور حکیمانہ ترتیب اختیار کرتے ہیں تاکہ جو لوگ اس کو قبول کریں اپنی طبیعت کی طلب سے قبول کریں اور پورا دین ان کے فکر و نظر اور روح و دل کے اندر جذب ہو جائے اسی چیز سے وہ رسوخ ایسا پیدا ہوتا ہے جو اوروں سے چھوڑا لے جانے کے بعد بھی دلوں سے نہیں نکلتا اور وہ ذوق تقویٰ پرورش پاتا ہے جو زندگی کے پھیلے ہوئے معاملات کے بید ترین گوشوں میں بھی کوئی چیز روح و دین کے خلاف برداشت نہیں کر سکتا۔

جو لوگ دین کے اس نظام کو اور انبیاء کرام کے اس طریق دعوت کی خوبیوں کو نہیں سمجھے ہیں وہی لوگ ہیں جو معرفت الہی پیدا کرنے سے پہلے لوگوں کو نہ صرف فرض نمازوں کا بلکہ تہجد و اشراق تک کا پابند بنانا چاہتے ہیں۔ جو نبی کی ضرورت اور اس کی اطاعت و پیروی کا اعتقاد پیدا کرنے سے پہلے لوگوں کی ڈاڑھیوں، لبوں اور پانچاموں کی پیمائش کرتے پھرتے ہیں، جو آخرت پر سچا اور سچا ایمان پیدا کرنے سے پہلے لوگوں پر خشیت، تقویٰ، تواضع اور فروتنی کا جمال دکھانا چاہتے ہیں۔ ان الٹی کوششوں سے ایک حد تک یہ ہو تو جاتا ہے کہ ڈاڑھیاں لمبی ہو جاتی ہیں، ازاریں اپنے صد کے اندر آ جاتی ہیں، چلتے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے ہونے ہر چیز میں ایک مصنوعی مسکینی نمایاں ہو جاتی ہے، کھانے پینے، کھانسنے اور چھینکنے ہر چیز میں پابندی سنت کا التزام و اہتمام پیدا ہو جاتا ہے لیکن چونکہ یہ سب کچھ غیر عقلی اور غیر فطری طریقہ پر پیدا کیا جاتا ہے اس وجہ سے اس تمام ہمہ تقویٰ کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ ”مجھ چھانے جاتے ہیں اور اونٹ نکلے جاتے ہیں“ اس طرح کے اتقیا نہیں دیکھتے کہ جو تہمتوں میں جا رہا ہے وہ پاک و طیب ہے یا طاغوت کی خدمت کر کے حاصل کیا گیا ہے لیکن اس امر کا انتہائی اہتمام کرتے ہیں کہ اس تہمت حرام کو کھانے کے بعد پانی دہنے ہی ہاتھ سے پئیں۔ بائیں ہاتھ سے نہ پئیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا دینی تصور یہ ہے کہ اگر ایک شخص کی نیت خالص

ہے تو وہ موجودہ نظام باطل کے اندر تھانہ داری، ڈپٹی کسٹری اور کونسلوں کی ممبری سب کچھ کر کے اللہ کو راضی اور اسلام کے جھنڈے کو اونچا کر سکتا ہے۔ انہی متقیوں کے اندر ہیں ایسے لوگوں کا بھی پتہ ہے جو اپنی خوش قسمتی پر بہت نازاں ہیں کہ انہیں اپنی لڑکی کے لیے ایسا دیندار بر ملا ہے کہ اس کی آزار بخونوں سے کبھی نیچے نہیں ہوتی اور فلاں حضرت کامرید ہے لیکن ان کی نظر اس بات پر نہیں جاتی کہ اس نے اپنی معاش کے لیے جو ذریعہ اختیار کیا ہے کوئی مسلمان جس ایمانی رکھتے ہوئے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سارا بے تکاپن درحقیقت نتیجہ ہے اس بات کا کہ ایک مدت سے مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی دعوت نہیں اٹھی جو ان کے سامنے ان کے پورے دین کو اس کے سسٹم کے ساتھ پیش کرتی اور تبلیغ و دعوت کے ہر مرحلہ میں دین کا جس قدر حصہ لوگوں کو دیتی اس کے پورے مقصدات ان پر واضح کر دیتی بلکہ جن لوگوں نے بھی اس سلسلہ میں کوئی کام شروع کیا، صلہ ضرورت کا شعبہ بنا اور نظام دین کی معرفت نہ ہونے کی وجہ سے جہاں سے چاہا شروع کر دیا اور جہاں چاہا ختم کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن مسلمانوں کے اندر کچھ دینی شعور ہے اس قدر اٹھا اور بے جا ہے کہ اس کو کسی صحیح دعوت کے لیے بنیاد بنا تا تو درکنار اس کو قائم رکھ کر کوئی صحیح دعوت شائد شروع بھی نہیں کی جاسکتی۔

اب اسی طرح بالاجمال اس اجتماعی استطاعت کی حقیقت پر غور کیجیے جس کو حضرات انبیاء کرام بن کو پیش کرنے میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ دین کے احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو طرح کے ہیں۔ ایک انفرادی احکام دوسرے اجتماعی احکام۔ انفرادی احکام افراد کے لیے ہوتے ہیں، اور ہر فرد کے لیے اس کی انفرادی حیثیت ہی میں، ان کی تعمیل ضروری ہے۔ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ۔ اجتماعی احکام کا تعلق جماعت سے ہے۔ جب جماعت وجود میں آجائے تو اس کا فرض ہوتا ہے کہ ان کی تعمیل کرے مثلاً وہ احکام جو معاشرت و سیاست اور جہاد سے متعلق ہیں۔ پہلی قسم کے احکام کی تعلیم و دعوت میں افراد کے تحمل کا لحاظ ہوتا ہے کہ ان پر بارش کی طرح احکام برسانے دیے جائیں کہ وہ گھبرا کے سب کچھ چھوڑ بیٹھیں۔ دوسری قسم کے احکام میں جماعت کے تحمل کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس قابل ہے بھی کہ نہیں کہ جو احکام اس کو



دیے جا رہے ہیں ان کا بوجھ اٹھا سکے۔ اس جماعتی استطاعت کا لحاظ نہایت ضروری بھی ہے اور اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہایت مشکل بھی ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کو تو اس معاملہ میں براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی ہوتی ہے۔ کیونکہ احکام و قوانین نازل ہی جماعت کی قوت و استعداد کے لحاظ سے ہوتے ہیں، البتہ جو لوگ انبیاء کے طریقہ پر کسی جماعت کو اٹھانا چاہتے ہوں ان کو اس معاملہ میں سرتاسر اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے اور جب تک انھیں احکام دین کی ترتیب نزول، اپنے وقت کے خاص حالات، اور ایک نبی اور غیر نبی کی جماعت کے فرق کا پورا پورا اندازہ نہ ہو، کبھی ان کا قدم صحیح راہ پر نہیں پڑ سکتا اور ہر وقت اس بات کا اندیشہ ہے کہ جس جماعت کی وہ قیادت کر رہے ہیں اس کی کشتی ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی کسی چٹان سے ٹکرا کے پاش پاش ہو جائے۔

جو لوگ اس امر سے واقف نہیں ہیں وہ پورے قرآن مجید کو اپنے سامنے دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پورا پورا ایک دن اتار دیا گیا تھا اور اس دن کے لمبے کو ایک ہی دن میں جاری و نافذ ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ جو جلد باز ہیں وہ ایک طرف توحید کی دعوت شروع کرتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی نظام قضا کی داغ بیل بھی ڈال دیتے ہیں۔ ایک طرف کفر باطنوت کی شرح شروع کرتے ہیں دوسری طرف طغوت کو الٹی میٹم بھی بھیج دیتے ہیں۔ اور جو حضرات حیلہ بازی اگر ان سے کہیں کہ غیر الہی نظام سے تعاون ناجائز ہے تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ رہیں کیوں استعمال کرتے ہو؟ ڈاک خانوں سے کیوں کام لیتے ہو؟ تار اور ٹیلیفون کا بائیکاٹ کیوں نہیں کرتے؟ اگر ان سے کہیں کہ ہندوستان دارالکفر ہے، اس کو دارالاسلام بنانے کی جدوجہد کرنا برسرِ ان کا فرض ہے، تو مطالبہ ہو گا کہ پھر یہاں سے ہجرت کیوں نہیں کرتے اور کفار سے جنگ کا اعلان کیوں نہیں کرتے؟ ان باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کو اس بات کی بالکل خبر نہیں ہے کہ کسی سرزمین کے نظام جاہلی کو نظام اسلامی سے بدل دینے کے لیے جو جو

اٹھتی ہے اس میں کیا ترتیب و تدریج ہے اور اس ترتیب و تدریج کے اندر کیا حکمتیں اور برکتیں ہیں۔ اور اس میں جماعت کی اجتماعی قدرت و استطاعت کا کس قدر صحیح اندازہ کر کے قدم اٹھانا پڑتا ہے اور اگر اس اندازہ میں ادنیٰ غلطی بھی ہو جائے تو کیا خطرے متصور ہیں؟

یہاں نیز یہ بات بتانے کا موقع ہے اور نہ چنداں اس کی ضرورت ہے کہ قرآن میں معاشرہ اور سیاست سے متعلق سارے احکام اس وقت نازل ہوئے ہیں جب کہ دارالاسلام بالفعل قائم ہو چکا ہے۔ اور ان احکام کے نازل ہونے میں بھی ایک ترتیب و تدریج ہے اور یہ ترتیب و تدریج جماعت کی استطاعت سے بالکل متوازی ہے۔ جب مسلمان اتنی تعداد میں ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی ایک علیحدہ ہیئت اجتماعی کی تشکیل کر سکتے ہیں اور اس مقصد کے لیے انھیں ایک آزاد گوشہ زمین بھی مل جاتا ہے تب انھیں نظام کفر سے قطع تعلق کا آخری حکم دیا جاتا ہے۔ اس طرح جب مسلمانوں کی جماعتی قوت کم از کم اتنی ہو جاتی ہے کہ وہ کفر کے مقابل میں ٹمک سکتے ہیں تب انھیں لڑائی کے لیے تیار اٹھانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا النقیاس جب مسلمان اس حیثیت میں ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک مستقل نظام معاشرت و نظام معیشت کو چلا سکیں تب انھیں نظام کفر سے ہر طرح کے سوشل بائیکاٹ کا حکم دیا جاتا ہے اور اسلام کے وہ قوانین و احکام نازل ہوتے ہیں جو مدنی و اجتماعی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ وقت آتا ہے کہ مسلمان وہ سیاسی قوت بہم پہنچا لیتے ہیں کہ بغیر کسی اندیشہ، مزاحمت خدا کی زمین پر خدا کے احکام کو جاری و نافذ کر سکتے ہیں تو ان کو وہ احکام و قوانین دیے جاتے ہیں جن کا تعلق بین الاقوامی سیاست سے ہے۔ ایک طالب علم کی ذہنی استعداد کی طرح ایک جماعت کی مادی استعداد بھی تدریجاً ہی بڑھتی ہے اور جو لوگ کسی جماعت کی قیادت کرتے ہیں ان کو سب سے زیادہ بیدار مغزی کے ساتھ جماعت کی اس استعداد ہی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کا صحیح صحیح اندازہ کیے بغیر جماعت پر کوئی بوجھ ڈال دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جو استعداد اس نے ایک مدت میں فراہم کی ہے وہ ساری

کی ساری برباد ہو جائے گی۔

یہ ساری تفصیل یہ سمجھانے کے لیے پیش کرنی پڑی ہے کہ آج جو دعوت ہم نے شروع کی ہے اس پر بعضوں کو تو یہ اعتراض ہے کہ اس میں سارا زور صرف اصولی مسائل پر ہے جزیئاً دین کا اس میں خاص اہتمام نہیں ہے۔ اور دوسرا اعتراض بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ باوجود یہ جماعت مدعی ہے کہ طاعت کے ساتھ ہر قسم کا تعاون ناجائز ہے لیکن زندگی کے بہت سے گوشوں میں یہ بھی طاعت کے ساتھ تعاون کر رہی ہے۔ ان دونوں جماعتوں کے سامنے ہم یہ حقیقت لانا چاہتے ہیں کہ آج جو کام ہم کر رہے ہیں وہ کسی بنی بنائی جماعت کے اندر کسی جزوی فساد کی اصلاح کا کام نہیں ہے بلکہ ایک ایسی سرزمین پر نظام حق کو از سر نو برپا کرنے کی دعوت ہے جہاں ایک نظام باطل پوری قوت کے ساتھ جا ہوا ہے۔ ایسی دعوت حق کا کام انجام دینے کے لیے حضرات انبیاء کرام نے جو نمونہ ہمارے واسطے چھوڑا ہے اس پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پروگرام میں اصولی طور پر دو چیزیں ملحوظ ہونی چاہئیں۔ ایک جماعت کی ذہنی استعداد کا لحاظ، دوسری جماعت کی مادی استطاعت کا لحاظ۔ جب ان دونوں چیزوں میں متوازنی اور تدریجی ترقی ہوتی ہے اور ان کی اس تدریجی ترقی ہی کے اعتبار سے ان پر ذمہ داریاں ڈالی جاتی ہیں تو جماعت کا صحیح ارتقاء وجود میں آتا ہے۔ ورنہ جماعت میں یا تو عقلی ضعف پیدا ہو جاتا ہے یا مادی یا دونوں طرح کا اور بالعموم دونوں ہی طرح کا ہوتا ہے کیونکہ ان میں ہر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے۔